باب سوم

رسالۂ محمدیؐ بنام گروہی اسلام

﴿ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعاً لست منھم فی شئی﴾

قرآنی دائرۂ فکر عقل اور وحی سے مملو ایک ایسے اکتشافی تصورِ حیات سے عبارت تھا جہاں وحی اور عقل ایک دوسرے کی معاون اور رفیق تھیں۔ قرآن عقلی رویّوں کو مہمیز کرتا اور عقل وحیِ ربانی کی تجلّیوں سے اپنے راستوں کو منور کرتی۔ عقل کو ہر لمحے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا کہ اسے اپنے تسخیری اور اکتشافی مشن میں ربّ کائنات کی پشت پناہی حاصل ہے۔ قرآن مجید نے جس عقلی رویّے کی تشکیل و ترویج پر زور دیا تھا اس کے نتیجے میں اکتشافات کی ایک نئی دنیا پیدا ہوگئی تھی۔ بحر و بر اور ارض و سمٰوات کی سرّیت سے پردہ اٹھنے کا ایک فطری لازمہ یہ بھی تھا کہ مسلم ذہن ایک طرح کی بین الاقوامیت کا حامل ہو۔ اقوام و ملل کا تہذیبی اختلاف، شعوب و قبائل کے تذکرے اور کلمۂ سواء کی باتیں گویا اس خیال سے عبارت تھیں کہ آخری پیغام کے حاملین کو ایک ایسے توحیدی نظام کا ڈول ڈالنا ہے جو تمام ہی اقوامِ عالم کے لیے پناہ گاہ کا کام انجام دے سکے۔

قرآنی دائرۂ فکر کے زوال اور اکتشافی ذہن کی موت نے صورت حال یکسر بدل کر رکھ دی۔ فتنۂ قتلِ عثمانؓ سے امت میں جو انتشار پیدا ہوا تھا اور اس حادثۂ فاجعہ سے سیاسی نظام کی بنیادیں جس طرح متزلزل ہوگئی تھیں اسے پھر دوبارہ مستحکم نہ کیا جا سکا۔ اموی اور عباسی خلافتوں کے مختلف ادوار میں خروج، بغاوتوں اور امامِ عادل کے ظہور کا سلسلہ جاری رہا۔ صرف آلِ بیت کے حلقے سے سیاسی خروج کرنے والوں کی تعداد ساٹھ سے زائد ہوگئی۔ ابتدائے عہد کے

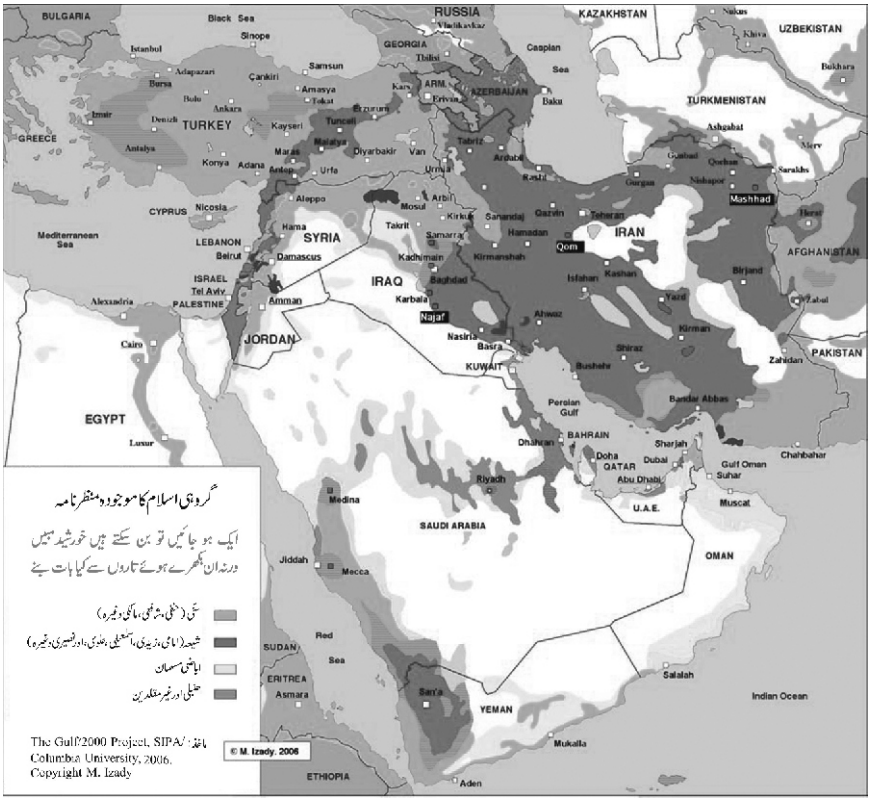

سیاسی نزاع نے وقتی طور پر شیعانِ عثمانؓ اور شیعانِ علیؓ کے جن سیاسی گروہوں کو جنم دیا تھا وہ آگے چل کر عقیدے کا سا تقدس حاصل کرنے لگے۔ سیاسی نزاع کے اس ہنگامے میں ہر گروہ نے قرآنِ مجید کو اپنے موقف کی حمایت میں پڑھنے کی کوشش کی۔ تفضیل و مناقب کی روایتوں کا بازار گرم ہوا اور بالآخر تنزیل پر تعبیر کی لغت غالب آ گئی۔ یہ کچھ وہی صورتحال تھی جو ﴿اِنّ الـذین فرقوا دینهم و کانوا شیعا﴾ سے عبارت تھی اور جہاں قرآنی فیصلے کے مطابق دین کے ان تمام دعویداروں کے ہاتھ سے دین کا اصل الاصل قالب رخصت ہو چکا تھا۔

تیسری صدی کے وسط تک صورتِ حال یہ ہوگئی کہ عالمِ اسلام میں مومن یا مسلم حنیف کے واقعی علم بردار یا تو سماجی منظر نامے سے غائب ہوگئے یا پھر شیعہ، سنّی اور خوارج کی باہمی رزم آرائیوں کے سبب حاشیے پر پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ چوتھی صدی میں مصر میں فاطمی خلافت کے قیام نے سیاسی نزاع کو دین کا قالب عطا کرنے میں کلیدی رول انجام دیا۔ صورت حال یہ ہوگئی کہ سندھ سے اندلس تک دینِ حنیف کی علمبردار تین متبادل خلافتیں اپنے نظری استحقاق کے لیے تاویلاتِ باطلہ کا سہارا لینے پر مجبور تھیں۔ تو دوسری طرف وہ لوگ جو اس دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے اپنی روحانی

سیادت کے لیے نظری جواز کی فراہمی میں مصروف تھے۔ ابتدائے عہد کے مسلم معاشرے میں اہلِ ایمان کی نظری شناخت صرف مومن کی تھی اور اسی مناسبت سے خلفائے رسولؐ امیر المومنین کہلاتے تھے۔ سیاسی فرقہ بندیوں، متبادل خلافتوں اور نظری گروہ بندیوں نے اہل سنت والجماعۃ والآثار، اہل العدل والاستقامہ اور آلِ بیت کے ہمنواؤں کے نام سے مختلف متبادل اور متحارب شناختیں پیدا کیں۔ چوتھی صدی تک صورت حال یہ ہوگئی کہ مختلف گروہوں نے اپنی اپنی پسند کی روایتوں پر مشتمل اپنی مذہبی کتابیں الگ مرتب کرڈالیں، پھر آگے چل کر ان گروہوں میں مزید فرقے پیدا ہوتے گئے۔ ہر فرقے کو اس بات پر اصرار رہا کہ حق صرف اسی کے پاس ہے، نجات پر صرف اسی کی اجارہ داری ہے دوسرے تمام گروہ خواہ وہ اسلام کے دعویدار ہی کیوں نہ ہوں، وہ دراصل جہنّم کی طرف دوڑے جارہے ہیں۔ بقول قرآن ﴿کل حزب بما لدیھم فرحون۔﴾

آج جب ہمارے اس انحرافِ فکری پر کوئی ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے، بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ دینِ حنیف کی شیعہ، سنّی یا اباضی تفہیم دین کے منزّل قالب کا اٹوٹ حصہ ہے جس کے بغیر اب بندگیٔ رب کا فریضہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ ہر فرقے کو فریقِ مخالف کے سلسلے میں تو شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ اس کے ہاتھوں سے رسالۂ محمدیؐ کب کا پھسل چکا، البتہ اسے خود اپنے انحراف کی سنگینی کا قطعی اندازہ نہیں۔ سنّیوں کا اسلام، اہل تشیع کے نزدیک قابل قبول نہیں اور اہل تشیع کا اسلام سنّیوں کے لیے یکسر لائقِ استرداد ہے۔ اباضی نقطۂ نظر کے مطابق یہ دونوں گروہ کفر النعمۃ میں مبتلا ہیں۔ خود شیعوں کے اندر اسمٰعیلی، زیدی، علوی اور دوسرے گروہ اثنا اشعریوں کے لیے قابل قبول نہیں۔ اسی طرح سنّی کیمپ فقہائے اربعہ کے خیموں میں منقسم ہے۔ مسلمانوں کے اس باہمی نظری انتشار نے شیعہ، سنّی، حنفی، شافعی، بریلوی، دیوبندی اور اس قبیل کی بے شمار منافرت اور مخاصمت کو جنم دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں کسی اجتماعی نظام یا دینی ریاست کا قیام ایک امر محال ہے۔ جہاں دین کا ایک قالب دوسرے سے مزاحم ہو وہاں اسلام کے اصل الاصل قالب کی تشکیل کے بغیر تجدید واحیاء کا خواب دیکھنا خود فریبی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

اسلام کا اصل الاصل قالب نہ سنّی ہے نہ شیعہ اور نہ ہی اباضی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہمارے علماء مدّت سے اسے سنّی، شیعہ اور اباضی فقہاء کی کتابوں میں تلاش کرتے رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ ائمہ اربعہ، ائمہ اہلِ بیت یا ''امامِ عادل'' کے بغیر دین کا کوئی تصور متشخص کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اصولی طور پر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ صدرِ اوّل کا اسلام ان التباسات سے ماوراء تھا۔ عہد رسولؐ اور عہدِ خلفائے راشدین میں نہ کوئی سنّی تھا اور نہ کوئی شیعہ، نہ کوئی حنفی تھا اور نہ کوئی جعفری۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج ان شخصی حوالوں کو کالعدم قرار دینے کے سبب ہمارے دین کا اعتبار جاتا رہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم مدّت سے اپنی تاریخ کو عقیدے کے طور پر پڑھتے آئے ہیں سو ہم اس بات

سے خوف کھاتے ہیں، مبادا اسلام کے اصل الاصل قالب کی تلاش میں متوارث اسلام کا بچا کھچا ڈھانچہ بھی زمین بوس ہوجائے اور پھر ہم خود کو ایک نظری بیابان میں پائیں۔

ہمارے خیال میں اسلام کے اصل الاصل قالب کی تلاش میں یہ سوالات ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ امام بمعنیٰ اولوالامر کے مقابلے میں امام بمعنیٰ روحانی پیشوا کی اصطلاح کب وضع ہوئی؟ مسلمانوں میں شیعہ اور سنّی فرقوں کا علیحدہ تشخص کس عہد میں منقح ہوا؟ سنّی فقہائے عظام کو ائمہ اربعہ کی تقدیسی حیثیت کب ملی؟ اہل تشیع کے ہاں بارہ ائمہ کا تقدیسی نظریہ کس دور میں پہلی بار سامنے آیا؟ مختصراً یہ کہہ لیجئے کہ دین کے مختلف قالب جو صدیوں سے ایک دوسرے سے متصادم اور متحارب ہیں یہ کس تاریخی اور سیاسی عوامل کی پیداوار ہیں۔ اگر ہماری نگاہیں اس عہد سے آگے دیکھ سکیں تو ہمارے لیے یہ متصور کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا کہ منزّل اسلام کا اصل الاصل قالب ہے کیا؟

اپنے نظری انحراف کی مرحلہ وار تفہیم کے لیے ہم سب سے پہلے اہل تشیع کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے ایسا اس لیے نہیں کہ ان کے ہاں انحراف والتباس کا کوہِ گراں بار موجود ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے اندر محبّانِ آلِ بیت کے سبب حدّت ایمانی کا احساس کچھ زیادہ پایا جاتا ہے اور اس لیے بھی کہ ان کے نظری انحرافات کے سائے مسلسل سنّی فکر پر پڑتے رہے ہیں۔ اسمٰعیلی اور اثنا عشری مسلمانوں کے انحرافِ فکری میں خود سنّیوں کو جابجا اپنے التباساتِ فکری کی جھلک دکھائی دے گی۔ ہمارا مقصد کسی فرقے کو مطعون کرنا نہیں بلکہ کمال غیر جانب داری سے تاریخ کا ایک ایسا مطالعہ پیش کرنا ہے جو ہمیں تاریخ سے ماوراء دیکھنے کا اہل بنا سکے۔ علاّمہ حلّی (۶۴۸ھ—۷۲۶ھ) نے جب اہل سنّت کے فکری نظام پر اعتراض وارد کیا تھا کہ انھوں نے مذاہب اربعہ ایجاد کیا اور قیاس کی راہ پر چل نکلے تو ابن تیمیہ سے اس سوال کا کوئی شافی جواب نہ بن پڑا۔ ہاں سنّی انحرافات کے مقابلے میں انھوں نے شیعہ انحرافات کی ایک طویل فہرست مرتب کر ڈالی۔ ہمارے خیال میں فریق مخالف کے بڑے انحرافات ہمارے چھوٹے انحرافات کے لیے جواز نہیں بن سکتے۔ گذشتہ سات سو سالوں میں حلّی کے اس سوال کی دھار اور بھی تیز ہوگئی ہے کہ اہل سنّت کے ائمہ اربعہ کے لیے دینی بنیاد ہے کیا؟ جب تک اہل سنّت اس سوال کا ایماندارانہ جواب فراہم نہیں کرتے انھیں اس بات کا اخلاقی حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ ائمہ سبعہ یا ائمہ اثنا عشر کے نظری جواز پر سوال قائم کریں۔ لیکن مسئلہ صرف ایک دوسرے کو آئینہ دکھانا نہیں بلکہ اپنی فرقہ وارانہ تاریخ سے ماوراء دیکھنے کا ہے۔ جب تک ہم میں خود احتسابی اور گروہی تعصب سے اوپر اٹھ کر دیکھنے کا یارانہ ہو ہم حقیقتِ نفس الامر کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اصل الاصل قالب کی تلاش کے اس مبارک عمل میں ہمارے اندر کم از کم اتنا حوصلہ تو ہونا ہی چاہیے کہ ہم اپنے نظری انحرافات کی بساط لپیٹنے کے لیے ابتداء سے ہی ذہنی طور پر تیار ہوں۔ گویا تاریخ کے اس مطالعے میں ہم نہ شیعہ ہوں اور نہ سنّی بلکہ فقط ایک طالب علم۔